ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالموں میں تاریخی و ثقافتی عناصر کی عکاسی

وحید مراد
پی ایچ ڈی محقق، شعبہ ءاردو جامعہ پشاور
ڈاکٹر فرحانہ قاضی
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ ءاردو جامعہ پشاور

ABSTRACT
Dr. Zahoor Ahmad Awan was a versatile writer. He was one of the renowned prose writers of Urdu literature. He has tried his hand at various genres of prose such as travelogue, research, criticism, Iqbaliat, sketch writing, letter writing, reportage writing, biography and column writing. Column writing is the major reference of Dr. Zahoor Ahmad Awan. Column is an important genre of journalism and Urdu prose. A column is a style of writing that is published with the writer's name on a regular basis in a newspaper or magazine under a permanent heading. It plays an important role in shaping public opinion and spreading awareness among the masses. Dr. Zahoor Ahmad Awan under look a range of diverse topics such as academics, literature, culture, history, ethics, socio-economics and national and international politics. This research mainly focuses on the historical and cultural elements in his columns. Apart from his eloquent diction, variety of the subject mattered and unique style is also the life blood of his column writing.
Keywords: Column, Journalism, Literature, Variety, Culture, History.

کالم ایک صحافتی صنف ہے۔کالم مستقل عنوان کے تحت کسی اخبار یا رسالے میں روزانہ یا ہفتہ وار شائع ہونے والی خاص اسلوب کی حامل تحریر ہوتی ہے جو کالم نگار کے نام کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔کالم میں روز مرہ کے اہم واقعات پر کالم نگار اپنے احساسات، تجربات، مشاہدات اور جذبات کی روشنی میں اظہار خیال کرتا ہے۔کالم نہ صرف رائے عامہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے، بل کہ عوام کی رہنمائی کا فریضہ بھی احسن طریقے سے ادا کرتا ہے۔مزید برآں کالم تعلیم و تربیت اور ادبی ذوق کی آبیاری بھی کرتا ہے۔کالم علمی و ادبی، سیاسی و سماجی، اقتصادی و ثقافتی اور بین الاقوامی حالات و واقعات سے باخبر رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔جب کوئی صحافی کالم لکھتا ہے تو اس کالم کی حیثیت ہنگامی اور وقتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ایسا کالم عموماً ایک دن کی تروتازگی رکھتا ہے، ایک روز گزر جانے کے بعد یہ اپنی اہمیت کھو دیتا ہے، لیکن جب کوئی ادیب کالم لکھتا ہے، تو اس کی شخصیت کا پرتو کالم پر بھی پڑنے لگتا ہے، اس طرح اس میں ادبی چاشنی بھی شامل ہو جاتی ہے اور یوں اس کے ڈانڈے ادب سے جا ملتے ہیں۔پھر یہ کالم ایک دن کے لیے نہیں، بل کہ سدا بہار بن جاتا ہے۔ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالم کچھ اسی نوعیت کے ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان ایک ہمہ جہت ادیب تھے۔انھوں نے بہ یک وقت کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔سفر نامہ نگاری ہو یا خاکہ نگاری، تحقیق ہو یا تنقید، سوانح نگاری ہو یا خود نوشت سوانح عمری، مکتوب نگاری ہو یا رپورتاژ نگاری، اقبالیات ہو یا ترجمہ نگاری ان کا قلم ہر موضوع پر فراٹے بھرتا تھا۔کالم نگاری ان کا بنیادی حوالہ ہے اور اس ضمن میں بھی ان کو بلند درجہ حاصل ہے۔ان کا کالم "دل پشوری" خاص و عام میں مقبول تھا۔معاشرے کا ایک بڑا طبقہ ان کے کالم ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔وہ ملکی و بین الاقوامی سطح کے نامی گرامی کالم نگار تھے۔ان کے قلم اور کالم کی فکری بو قلمونی اور اسلوب کی نیرنگی نے ایک جہاں کو اپنا گرویدہ بنایا ہوا تھا۔اس ضمن میں ان کے کالم ایک کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔درحقیقت ان کو کالم نگاری نے ہی شہرت اور ناموری کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔جتنی شہرت ان کو کالم نگاری کی بدولت ملی، وہ کسی دوسری ادبی صنف کی وجہ سے نہیں ملی۔ان کی اس شہرت میں ان کے منفرد اور دل کش اسلوب کے ساتھ ساتھ متنوع موضوعات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

خالد سہیل ملک پشاور کے معروف کالم نگار اور افسانہ نگار ہیں، وہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کالم نگاری کے بارے میں کہتے ہیں:

> "ڈاکٹر ظہور کی بہت ساری حیثیتیں ہیں۔وہ ایک محقق، استاد، سفر نامہ نگار، خاکہ نگار اور ایک کالم نگار ہیں۔لیکن اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ ان کی شہرت اور نیک نامی کی سب سے بڑی وجہ ان کی کالم نگاری ہی رہی ہے۔ان کی کالم نگاری کی دلپذیری اور ہر دلعزیزی کی وجہ ان کا اسلوب اور ان کی اپروچ ہے۔وہ عام جغادری کالم نویسوں کی طرح بڑی بڑی خبریں بریک نہیں کرتے، نہ ہی سیاست کے دقیق مسئلوں پر اپنی فراست کے نقطے بکھیرتے ہیں، بلکہ وہ سماج اور اس کے حالات کو ایک "عام" آدمی کی نگاہ

سے دیکھتے ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالموں کی شہرت، مقبولیت اور انفرادیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے کالم پڑھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کالم ہیں، افسانے ہیں یا انشائیے، کیوں کہ اس میں افسانے کی دل کشی اور دل چسپی بھی ہے، انشائیے کی بات سے بات پیدا کرنے کی خوبی بھی، شعور کی رو کی تکنیک بھی اور شگفتہ انداز بیاں بھی، ڈرامائی صورت حال بھی اور خطابت کی چاشنی بھی۔ پروفیسر محمد اقبال پراچہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"بعض اوقات انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ تحریریں ہیں کیا۔ ان کے کالموں کو کس زمرے میں رکھا جائے۔ یہ کالم ہیں یا افسانچے، انشائیے یا میدان جنگ کے خطبات، جو کچھ بھی ہیں کچھ مختلف ہی ہیں۔ ان کا موازنہ عام اخباری کالموں یا ہم عصر لکھنے والوں کی عام تحریروں سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔"(۲)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے کالم کی صنف کو وسعت و وقار بخشا اور کالم نے ان کو شہرت اور ناموری دی۔ انھوں نے کالم نگاری کو ایک آدرش اور مشن کے طور پر شروع کیا اور ان اصولوں کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی، جو انھوں نے کالم نگاری شروع کرنے سے قبل اپنے لیے مقرر کر لیے تھے۔ وہ ہمیشہ انہیں اصولوں پر چلتے رہے اور ایک کامیاب کالم نگار بنے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کالم کی اہمیت و افادیت سے واقف تھے، وہ کالم کو صرف صحافت کا ایک حصہ نہیں سمجھتے تھے بل کہ وہ اس کو ایک ادبی صنف اور "چیزے دگر" قرار دیتے تھے۔

کالم کے موضوعات کا دائرہ کار نہایت وسعت کا حامل ہے۔ کالم نگاری کے لیے کسی خاص موضوع کی کوئی قید نہیں۔ معاشرے میں جس سمت بھی نظر ڈالی جائے، بے شمار موضوعات کالم کا مرکز و موضوع بننے کے لیے موجود ہوتے ہیں, بس اس کے لیے کالم نگار کے پاس بصیرت اور بصارت کا موجود ہونا لازمی ہے۔ سیاست، تجارت، مذہب، معیشت، سماج، اخلاقیات، فیشن، ادب، فنون، سائنس، تعلیم، جرائم، حادثات، بچوں کی تربیت، اغوا برائے تاوان، دہشت گردی، پولیس گردی، منشیات، بھوک، افلاس، ظلم، جبر، بے روزگاری، خودکشی، انتشار، افراتفری، منافقت، دکھاوا، دوغلا پن، سماجی گھٹن، نفسیاتی امراض، ڈاکٹروں کی بے حسی، اساتذہ کی نااہلی و تشدد، فلم، قانون، زراعت، علم نجوم، عورتوں کے مسائل، بے انصافی، طبقاتی تقسیم، ہجرت، تارکین وطن کے مسائل، چوری چکاری، فریب، دھوکا، جنسی امراض، بین الاقوامی حالات و واقعات اور اشخاص غرض بے شمار اور انگنت موضوعات ہیں، جو کالم کا موضوع بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالموں میں موضوعاتی بوقلمونی اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی، اخلاقی، سائنسی، نفسیاتی اور بین الاقوامی موضوعات پر انھوں نے خوب خامہ فرسائی کی ہے۔ یہی موضوعاتی رنگارنگی ہی ہے، جس نے ظہور اعوان کو کالم نگاری کی دنیا میں منفرد مقام و مرتبہ عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر روبینہ شاہین ان کی کالم نگاری کے متنوع موضوعات کے متعلق لکھتی ہیں:

"۔۔۔ہماری ساری خود فریبیاں، قول و فعل میں تضاد، قومی معاملات سے بے اعتنائی، معاشرتی بے حسی، سماجی منافقتیں، نمود نمائش کی خواہش، ابتر انتظامی حالات، سیاسی دھوکے غرض زندگی کے ہر شعبے کی ناہمواریاں ظہور صاحب کے قلم کی رو میں ہیں اور یہی بوقلمونی ان کے کالموں کی مقبولیت کی اصل وجہ ہے"۔(3)

تاریخ گزرے ہوئے وقت کا نام ہے جسے ماضی بھی کہا جاتا ہے۔ گزرا ہوا ہر لمحہ، گھڑی،، واقعہ اور حادثہ تاریخ ہے، جو بھی لمحہ حال سے ماضی میں داخل ہو جاتا ہے، وہ تاریخ کہلاتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بھی ایک انسان کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ماضی کو بھلا کر انسان حال اور مستقبل کو بہتر نہیں بنا سکتا۔ تاریخ کسی انسان یا قوم کو ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کرتی ہے اور مستقبل میں ان سے بچاؤ کا فریضہ سر انجام دیتی ہے۔ تاریخ قوموں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرتی ہے اور شخصی، ذہنی اور قومی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ اردو کی معروف لغت "فیروز اللغات" میں تاریخ کی تعریف کچھ ان الفاظ میں درج کی گئی ہے:

"لغوی طور پر تاریخ سے مراد ایک دن، ایک رات، مہینے کا ایک دن یا کسی چیز کے ظہور کا وقت یا ایسا فن یا کتاب ہے جس میں مشہور آدمیوں اور بادشاہوں کے وقائع، حالات، پیدائش، وفات یا کسی عہد کے وقائع، روایات، قصے، افسانے اور جنگ نامے

درج ہوں۔"(4)

اصطلاحی معنوں میں تاریخ ایک ایسا علم ہے جس میں گزرے ہوئے حالات، واقعات اور اقوام کی زندگی کو موضوع بنا کر ماضی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ماہرین کے خیال میں تاریخ ایک ایسا علم ہے جس کی کوکھ سے دنیا کے تمام علوم نے جنم لیا ہے۔اسی وجہ سے اسے علوم کی ماں بھی کہا جاتا ہے۔

ثقافت کو انگریزی میں کلچر کہا جاتا ہے جو تہذیب کا ایک عنصر ہے اس کو ایگری کلچر کے ساتھ جوڑ کر اس کا رشتہ زمین کے ساتھ جوڑا جاتا ہے یعنی انسان کی زمین یا مٹی کے ساتھ وابستگی اور محبت، ثقافت کے عکس ہیں۔زمین سے مضبوط رشتہ اور تعلق رکھنا اور ہر حالت میں یہ رشتہ یا تعلق استوار رکھنا ثقافت ہے۔ میلے ٹھیلے، تہوار، عرس، جلوس، عیدین، بسنت، دسہرا، ہولی، دیوالی، ایسٹر، میلاد، نوروز، کھیل، تماشے، آرٹ، زبان، فنون، مذہب، علم، ادب، موسم، جغرافیہ، زراعت، صنعت، شادی بیاہ اور موت کی رسومات، آمدورفت، عمارات، بازار، سڑکیں، کھانے، مشروبات، برتن اور موسیقی سب ثقافت کے اجزا ہیں۔

کوئی بھی ادیب اپنی تاریخ و ثقافت سے بیگانہ رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔وہ جس معاشرے میں رہتا ہے اور جن اداروں میں پڑھتا ہے، جن گلیوں، محلوں اور باغوں باغیچوں میں پروان چڑھتا ہے اور جن کھیلوں، تہواروں اور میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتا ہے۔ان ساری چیزوں کے اثرات وہ جذب و قبول کرتا رہتا ہے۔یہ چیزیں اس کے خمیر میں شامل ہوتی جاتی ہیں اور ان سے وہ عمر بھر چھٹکارا نہیں پاتا۔ثقافتی اقدار کسی انسان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں۔تہذیب و ثقافت اور انسان کا تعلق اٹوٹ ہے۔کسی جگہ رہتے ہوئے وہاں کی ثقافتی اقدار کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔یہ اقدار انسان اور قوم کی پہچان اور شناخت ہوتی ہیں۔ثقافتی سرگرمیوں میں شرکت سے ایک انسانی گروہ یا معاشرہ صحیح معنوں میں ایک متمدن اور ایک تہذیب یافتہ قوم کہلانے کے قابل بن جاتی ہے۔

تاریخ، ثقافت اور تخلیق کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔کسی بھی معاشرے کی تمدنی حالت کا اندازہ اگر تاریخ سے نہ لگایا جاسکے تو اس زمانے کا ادب بھی اس ضمن میں آئینے کا کام کر سکتا ہے۔کالم چوں کہ ادب میں شامل ہے اس لیے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کالم نگاری میں تاریخی و ثقافتی شعور کی تلاش ادب کی ایک بڑی خدمت ہے جو ہمارا موضوع ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا تھا۔انھوں نے دنیا کے کئی ممالک کی سیاحت کی تھی۔وہ اپنے کالموں میں مختلف اقوام کی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں آگاہی فراہم کرتے ہیں۔اس کے ذریعے وہ اپنے مضمون و مفہوم کی وضاحت موثر و دلنشین انداز میں کرتے ہیں۔ان کے کالموں میں ملکی و غیر ملکی تاریخی و ثقافتی شخصیات، شہروں اور علاقوں کے حوالے سے وہاں کی تاریخ و تہذیب کے نمایاں خدوخال ملتے ہیں۔وہ تاریخی واقعات اور شخصیات کو سامنے لا کر عوام میں جوش، جذبہ اور انقلابی خیالات و رجحانات کی آبیاری کرتے ہیں۔ڈاکٹر ظہور اعوان کی کالم نگاری میں تاریخی و ثقافتی شعور کو تین زاویوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ایک پہلو پشاوری تاریخ و ثقافت کی عکاسی کا ہے، چوں کہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان پشاور شہر میں پیدا ہوئے اور یہیں پل کر جوان ہوئے، عمر کا زیادہ حصہ اسی شہر میں گزارا، اس وجہ سے یہاں کی تاریخ و ثقافت کی عکاسی قدرے زیادہ ہے۔اس حصے کو مقامی رنگ یا پشاوریت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ثقافت و تاریخ کے نقوش اس حصے میں ذرا شوخ اور گہرے ہیں۔تاریخی و ثقافتی شعور کی عکاسی کا دوسرا پہلو ملک کے دوسرے شہروں سے تعلق رکھتا ہے، جس میں اسلام آباد، کراچی اور لاہور وغیرہ کا ذکر ہے۔ڈاکٹر ظہور اعوان ایک علمی و ادبی شخصیت تھے اور وہ علمی و ادبی سیمیناروں، تقریبوں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے ملک کے دوسرے شہروں کا سفر بھی کرتے رہتے تھے۔اس لیے دوسرے شہروں کی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں بھی اپنے کالموں میں پیش کرتے ہیں۔تیسرا پہلو بیرون ملک کا ہے، جس میں یورپ و امریکا کے شہروں کی تاریخ و ثقافت تمام تر خدوخال سمیت نظر آتی ہے، ڈاکٹر ظہور اعوان اس حصے میں یورپی طرز زندگی کا موازنہ اپنے ملک سے کرتے ہوئے تقابل کی ایک دل چسپ فضا پیدا کرتے ہیں۔اس حصے میں یورپ و امریکا کے اچھے برے تمام پہلوؤں کو ایک حقیقت پسند لکھاری کے نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالموں میں پشاور کی تاریخ و ثقافت کے بارے میں نہایت اہم معلومات ملتی ہیں۔وہ پشاوری روڑے تھے اور ان کو اس شہر خوباں اور شہر طرح دار سے بے پناہ انس اور محبت تھی۔پشاور کی محبت ان کی نس نس میں خون کی طرح دوڑتی تھی۔اپنے ایک کالم میں خود لکھتے ہیں:

"میرے بعض قارئین کو شکوہ ہے کہ میرے کالم زیادہ تر پشاور کے اردو گرد گھومتے ہیں پشاور سے باہر کے دیہات کی بات نہیں کرتے اس کا ایک سیدھا جواب تو یہ ہے کہ میرے کالموں کا نام ہی پشاور سے ماخوذ ہے۔ پشاور نامہ، دل پشوری یہ نام ممکن ہیں میں نے غیر ارادی طور پر رکھے ہوں، مگر بات یہی ہے کہ پشاور جس کی رگوں پٹھوں میں بیٹھ جائے نکلتا نہیں آدمی بھلے پشاور سے نکل جائے پشاور اس کے اندر سے نہیں نکلتا۔"(5)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے پشاور کو ایک موضوع کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کی تمام تحریروں میں چاہے وہ سفر نامہ ہو، خاکہ ہو، رپورتاژ ہو، یا کالم، ان کا قلم اس موضوع پر بے تکان لکھتا چلا جاتا ہے اور کہیں بھی رکنے کا نام نہیں لیتا۔ خالد سہیل ملک ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کالم نگاری کے اس پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" ظہور اعوان کے کالموں کے موضوعات تو بہت ہیں مگر ان کا مستقل موضوع "پشاور" ہے۔ پشاور ڈاکٹر صاحب کا محبوب بھی ہے اور پشاور ان کا ناسٹیلجیا بھی ہے۔ دکھ بھی ہے اور سکھ بھی۔ پشاور کے موضوع پر ان کے کالم شاہکار کالم ہیں بلکہ کالم سے آگے کی کوئی چیز ہیں۔ پشاور کی قدیم رہتل کے وہ حافظ ہیں، اسی حافظے کا استفادہ کرتے ہوئے ماضی اور حال کے تقابل بھی پیش کرتے ہیں۔"(6)

مذکورہ اقتباس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کو پشاور شہر سے کتنی محبت اور انسیت تھی۔ جب بھی وہ اس موضوع پر لکھنا شروع کرتے ہیں، ان کی طبیعت میں جولانی اور قلم میں روانی آجاتی ہے۔ وہ مزے لے لے کر پشاور کی باتیں اور یادیں دہرانے لگتے ہیں۔ پشاور کے ساتھ وہ جیتے ہیں اور پشاور کے ساتھ ہی وہ مرتے ہیں۔ ان کی ساری خوشیاں اور سارے غم پشاور سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر پشاور خوشحال، صاف ستھرا، پرامن اور ترقی کے راستے پر گامزن ہے تو وہ خوش ہیں اور اگر پشاور بموں دھماکوں کی زد پہ ہے، روزانہ لوگ مر رہے ہیں، ہر گھر میں ماتم اور نوحہ ہے، ہر طرف گندگی اور غلاظت کے ڈھیر ہیں، خودکشیوں، ڈاکوں اور قتل وغارت کا راج ہے تو وہ پریشان اور غم زدہ ہو جاتے ہیں۔

پشاور شہر کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ یہ شہر زمانہ قدیم سے مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا امین رہا ہے۔ پشاور شہر کو وسط ایشیا کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ اس شہر کے بالکل آغاز پر معروف درہ خیبر واقع ہے، جسے باب خیبر یعنی خیبر کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ اسی دروازے سے دنیا کی مختلف اقوام جیسے: ایرانی، یونانی، منگول، آریا، مغل، غزنوی اور غوری وغیرہ داخل ہوئیں، جنھوں نے اس شہر کی تہذیب و تمدن پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شہر رنگا رنگ تہذیبوں اور ثقافتوں کی ایک آماجگاہ بن چکا ہے، لیکن اس کے باوجود اس شہر کی اپنی ایک انفرادی حیثیت بھی ہے۔ اس کی اپنی مخصوص روایات و رسومات ہیں اور ایک تہذیبی و ثقافتی سرمایہ ہے جو کسی اور جگہ نہیں مل سکتا۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے اپنے کالموں میں جگہ جگہ ان روایات اور ثقافتی سرمایے کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اب آہستہ آہستہ مٹتا جارہا ہے، ان کی یادیں صرف باقی رہ گئی ہیں۔ پشاور کی قدیم تاریخی و ثقافتی چیزوں میں "صندلی" کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

"ہم آج اپنے شہر کی ایک ثقافتی چیز یعنی صندلی کا ذکر کریں گے۔۔۔ صندلی ایک چوکور میز کو کہتے ہیں۔ پشاور کے پرانے گھروں میں پرانے زمانے میں اس میز کو کمرے کے وسط میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اس میز کے اندر ایک انگیٹھی میں کوئلے رکھ دئے جاتے تھے۔ کوئلوں پر اس قدر راکھ ڈال دی جاتی تھی کہ ان کی گرمی کپڑے کو نہ جلا سکے۔ اس صندلی کے اوپر جہازی سائز کے بڑے بڑے چوکور لحاف ڈال دئے جاتے۔ یہ لحاف خاص طور پر صندلی کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ اس صندلی کے گرداگرد تلائیاں اور گدیلے ڈال دئے جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے موٹے موٹے گاؤ تکیے رکھ دئے جاتے۔ گھر کے سارے لوگ لحاف میں پاؤں دے کر بیٹھ جاتے۔ اندر سے ہلکی ہلکی حدت سارے لحاف کو اس قدر گرم کر دیتی کہ جو بیٹھتا وہ اٹھنے کا نام نہ لیتا۔"(7)

"گھنٹہ گھر" پشاور کا ایک تاریخی مقام ہے، جس کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ گھنٹہ گھر، شہر پشاور میں انگریزی دور کی ایک یادگار ہے ایک روایت کے مطابق اسے حکومت برطانیہ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر لالہ بالمکند نے ۱۹۰۰ء میں تعمیر کرایا، اس وقت اس کا نام "کنگھم کلاک ٹاور" رکھا گیا۔ اس کے لیے لندن سے چار گھڑیاں تحفے کے طور پر آئیں۔ قصہ خوانی، چوک یادگار، پشاور میوزیم اور اسلامیہ کالج کی طرح گھنٹہ گھر بازار بھی پشاور کی

ثقافتی و تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ڈاکٹر ظہور اعوان نے اپنے ایک کالم "محبوب کی گلی گھنٹہ گھر اور گھنٹہ بھر" میں اس تاریخی و ثقافتی نشانی کے گرداگرد لگنے والے پر رونق بازار، پشاوری روایات اور پشاور سے تعلق رکھنے والے ایک کردار لالے گل کی عکاسی بڑے دل چسپ، حقیقی اور تفصیلی انداز میں کی ہے:

"اندرون شہر کے باسیوں کی روایت ہے کہ مریضوں کا صدقہ اتارنے کے لئے لوا حقین اور تیاردار روٹیوں کی خیرات کرتے ہیں۔جو پرانہ پشاوری اپنے کسی عزیز کی عیادت کرنے جاتا ہے آتے وقت روٹیاں خرید کر بانٹنے کے لئے سو پچاس روپیہ اسے دے آتا ہے۔یہ رقم یا اس کا کچھ حصہ گھنٹہ گھر کے نانبائی کے پاس لوگ پہنچا دیتے ہیں۔ہوتے ہوتے یہ نانبائی اس قسم کی روٹیوں کی تقسیم کا ایک رضاکارانہ ادارہ بن گیا ہے۔۔۔گھنٹہ گھر چوک شہر کی خوشیوں اور رونقوں کا بھی مرکز ہے۔یہاں آس پاس بینڈ باجے والوں کے بالاخانے بھی ہیں۔۔۔شہر کے لوگ شادی بیاہ اور مہندی بارات کے لئے ان فنکاروں کو بک کرنے کے لئے آتے ہیں۔۔۔اسی گھنٹہ گھر کے آس پاس کھیر فالودے قلفیوں، قراقلی ٹوپیوں، پکوڑوں کی دکانوں کے آگے پھولوں کے گجرے اور سہرے اٹھائے گل فروش بھی کھڑے نظر آتے ہیں۔۔۔اس گھنٹہ گھر کے آس پاس ایک پہلوان قتلمہ فروش بھی ہوتا تھا جس کے قیمے کے پراٹھے لوگوں کو اب بھی یاد ہیں۔خوبصورت سائیکل والا گل جی یہاں ہوتا ہے تو عالمی شہرت یافتہ فنکار گل جی کا گھر بھی کہیں آس پاس ہے۔یہ گھنٹہ گھر چوک نہیں محبوب کی گلی ہے جہاں سے دن میں بار بار گزرنا اہل پشاور کے دل کی آرزو ہوتی ہے۔"(8)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کو قدیم پشاوری تہذیب و تمدن سے بہت محبت ہے۔وہ بار بار قدیم پشاور کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں اور قدیم پشاور اور یہاں کے باسیوں کو آواز دینا چاہتے ہیں۔اس ضمن میں ان کے ہاں ایک قسم کی ناسٹلجیائی کیفیت پائی جاتی ہے۔وہ اس شہر طرحدار کو جب اجڑتا ہوا دیکھتے ہیں تو خون کے آنسو روتے ہیں۔انھیں یہاں کی قدیم تہذیب و اقدار کے مٹنے کا بڑا غم ہے۔اپنے ایک کالم "چتراں والا کٹورہ اور ماں کی یاد" میں پشاوری تہذیب و ثقافت کی نشانی چتراں والے کٹورے سے متعلق لکھتے ہیں؛

"کبھی ہم اہل پشاور صبح سویرے اس کٹورہ میں تخم ملنگا اور اسپغول کا گڑ والا خرمانیوں بھرا شربت پیا کرتے تھے۔ساتھ سچے گلابوں سے مہکتا ٹھنڈا پانی بھی مگر اب گھڑے رہے نہ گھڑونچیاں نہ گھڑوں پر امونڈھے چتراں والے کٹورے۔یہ کٹورے ہماری ماؤں دادیوں کو تانبے کے دوسرے برتنوں کے ساتھ جہیز میں ملا کرتے تھے۔قلعی ہو جاتی تھی تو یہ کٹورے روپہلے اور قلعی پیلے سنہرے لگتے تھے اور ان کے نقش و نگار کو چتر کہا جاتا ہے۔اپنی دلآویز جھلملاہٹ سے تاریخ کے قصے اور صدیوں کی داستانیں سناتے تھے۔یہ اب بھی قصہ خوانی بازار کے مسگر حصے میں دکانوں پر بطور ڈیکوریشن پیس ملتے ہیں۔"(9)

ہر علاقے یا خطے کے کچھ مخصوص کھانے اور مشروبات ہوتے ہیں، جو انہیں علاقوں یا خطوں سے منسوب ہوتے ہیں اور انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اگرچہ یہ کھانے یا مشروبات کوئی نئی چیزیں نہیں ہوتیں مگر ان کی تیاری اور پیش کش میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ، سلیقہ اور اہتمام پیش نظر رکھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے یہ کسی خاص مقام سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور ممتاز و امتیازی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔شہر پشاور کے کھانوں کی دھوم تو ساری دنیا میں مچی ہے۔یہاں کے پکوانوں اور مشروبات کی بیرون ملک بھی بڑی مانگ ہیں۔خصوصاً چپلی کباب، سری پائے، کلہ پانچہ، کڑاہی گوشت، قہوہ، تخم ملنگا کا مشروب، قصہ خوانی اور چوک یادگار کا فالودہ اور اس طرح کے دوسرے پکوان اور مشروبات اس شہر خوباں کی ثقافتی پہچان ہیں ۔ڈاکٹر ظہور اعوان چوں کہ ٹھیٹھ پشاوری تھے، اس لیے انھوں نے یہ ساری چیزیں خود دیکھی اور استعمال کی تھی، اس لیے وہ اپنے کالموں میں ان چیزوں کا ذکر بڑے مزے سے کرتے ہیں۔اپنے ایک کالم "قہوے کی ریسائیکلنگ، قصہ خوانی کے تھڑے" میں لکھتے ہیں:

"شہر پشاور کی اور بہت سی داخلی شہرتیں ہیں۔یہاں کے چپلی کباب ملک بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔جہاں پشاور کا ذکر آیا وہاں چپلی کباب اور کڑاہی گوشت کی بات چھڑی۔حالانکہ چپلی کباب اور کڑاہی گوشت ملک بھر میں جگہ جگہ دستیاب ہے مگر پشاور کے لئے یہ ثقافتی علامتوں کا درجہ اختیار کر گئی ہے اور ایک چیز جس کا ذکر کم کم ہوتا ہے وہ ہے سری پائے یا پشاور کی مخصوص

نہاری۔ سری پائے ملک بھر میں پکتے ہیں مگر پشاور میں بھینسوں اور سنڈوں کے سروں کا قلہ پانچہ بہت لذیذ ہوتا ہے۔۔۔ پشاور والوں کا ایک اور خاص پکوان دیگ پلاؤ ہے جس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے شہر میں نہیں ملتی۔ سردیوں کے موسم میں پشاور میں حلیم بھی پکتی ہے۔ سخت کڑکڑاتی سردی میں اصلی گھی، انڈوں اور پراٹھوں کے ساتھ حلیم کھائی جائے تو لطف ہی کچھ اور ہے۔ پشاور کا قہوہ عرف گرین ٹی پشاور کا مشہور مشروب ہے۔ بقول شخصے اندرون شہر کے پشاوریوں کی یہ تورگوں میں دوڑ رہا ہے۔ صبح آنکھ کھلنے سے لیکر رات سونے تک بس قہوے کی (کے) دور ہی چلتے رہتے ہیں۔"(10)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے اپنے کالموں میں پشاور شہر کے ذرائع نقل و حمل کا بھی ذکر کیا ہے۔ ظہور اعوان نے بیسویں صدی کا پشاور اپنے کالموں میں زندہ کر دیا ہے۔ وہ قدیم تہذیب و ثقافت کے دلدادہ ہیں اور قدیم تہذیب و ثقافت کو بار بار یاد کرتے ہیں۔ شہر پشاور کے مٹتے ہوئے اقدار کو یاد کرتے وقت، ان کو بیتا ہوا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ شہر پشاور میں، کسی زمانے میں تانگوں کی سواری ہوتی تھی، جس میں بیٹھ کر سارے شہر کی سیر کی جاتی تھی۔ شہر میں گھومنے اور سفر کرنے کا یہ واحد وسیلہ تھا، اس میں بیٹھ کر یک گونا طمانیت اور سکون کا احساس ہوتا تھا، اوپر سے گھوڑے کے ٹاپوں کی ٹکاٹک سے ایک قسم کی موسیقی کانوں میں رس گھولتی تھی۔ پھر جی ٹی ایس سروس شروع ہوئی جس نے تانگہ کلچر کا خاتمہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر ظہور اعوان اپنی یادوں کو سینے سے لگائے پچاس کی دہائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آبادی کہاں تھی لوگ کہاں تھے۔ گلیاں بازار کھلے کھلے نظر آتے تھے۔ تانگے ٹکاٹک چلتے دکھائی ہی نہیں سنائی دیتے تھے۔ کابلی تھانے کے باہر تانگوں کی قطاریں صدر کی طرف منہ کئے کھڑی ہوتی تھیں، صدر کے لئے ایک ایک آنہ سواری تھی۔ تانگے میں چار سواریاں بیٹھتی تھیں۔ بسوں کا نام و نشان نہ تھا۔ پچاس کی دہائی میں ہمارے سامنے جی ٹی ایس سروس شروع ہوئی۔ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے سامنے ایک دکان میں اس کا اڈہ قائم ہوا۔ ایک آدھ سبز رنگ کی بس صبح سویرے کھڑی نظر آتی تھی۔ ہم اس جگہ سے سوار ہو کر ایبٹ آباد جاتے تھے۔"(11)

کالم نگار ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے ان کالموں کے ذریعے اپنے بچپن کو بھی آواز دی ہے۔ بچپن انسان کی زندگی کا یادگار زمانہ ہوتا ہے، جس کو مرنے تک یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دور انسان کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے جس کے کھو جانے کا دکھ اور غم انسان کو ہمیشہ ستاتا اور تنگ کرتا رہتا ہے۔ انگریزی کے ممتاز شاعر جان ملٹن نے بچپن کے زمانے کو "جنت گم گشتہ" یعنی کھوئی ہوئی جنت کہا تھا۔ انسان کتنے ہی اعلیٰ مقام و مرتبے تک پہنچ جائے لیکن کبھی کبھار بچپن کی معصوم شرارتیں اور حسین یادیں اسے ایسی وادیوں میں لے جاتے ہیں، جہاں سے واپس لوٹنے کو دل نہیں کرتا۔ بچپن کی پیاری یادیں تاعمر انسان کے دماغ و دل کے نہاں خانوں میں روشن رہتی ہیں۔ گھنٹوں گھنٹوں کھیل میں مصروف رہنا، انگلی پکڑ کر سیر کو جانا، تتلیاں پکڑتے ہوئے دور دور تک نکلنا جانا، کاغذ کی کشتیاں تیرانا و جہاز اڑانا، ریت کے گھروندے بنانا اور خود ہی گرانا، نانی یا دادی اماں کی کہانیاں رات گئے تک سننا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ضد اور جھگڑا و تکرار کرنا جیسی انگنت یادیں تاحیات انسان اپنے سینے سے چمٹائے رکھتا ہے۔ اس عمر میں نہ تو دولت کی حوص ہوتی ہے، نہ ہی اپنے فائدے کی سوچ، نہ شہرت کی خواہش اور نہ ہی اپنی رسوائی کا خوف، نہ ماضی کا غم اور نہ ہی روشن مستقبل کی فکر شاید ایسی کو بچپنا کہتے ہیں۔

ڈاکٹر ظہور اعوان پشاور کے مشہور قدیمی و ثقافتی مرکز شاہی باغ میں فٹ بال کھیلنے جاتے تھے۔ اپنے بچپن کے کھیل کود کے دنوں کو یاد کر کے لکھتے ہیں:

"آج شام میرے پاس کرنے کو کوئی کام نہ تھا جو کتاب مجھے شام کو ختم کرنی تھی وہ سہ پہر تک ختم ہو چکی تھی موسم خوشگوار تھا، سوچا آج پنی (اپنی) پرانی یادوں اور بچپن کو تلاش کروں ایک مدت ہوئی میں اپنے شہر کے سب سے بڑے پارک شاہی باغ نہیں گیا تھا بچپن اور جوانی کی بے شمار گرم و سرد دوپہریں شامیں اس باغ میں گزری تھیں کبھی فٹ بال کھیلتے کبھی پھول توڑتے اور تتلیوں کے پیچھے بھاگتے کبھی کتاب بدست امتحانی سوال یاد کرتے پھر وقت اور زمانے نے مجھ سے یہ سب کچھ چھین لیا۔"(12)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے اپنے کالموں میں پشاور کے پرانے ٹھنڈے کنوؤں اور ان سے پانی لانے والے ماشکیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ پرانے زمانے میں جب ہر گھر میں نلکے یا کنویں نہیں ہوتے تھے تو پشاور کے باسی شہر کے بڑے بڑے ٹھنڈے کنوؤں سے پانی بھر کر مٹکوں میں لاتے تھے یا

ماشکیوں کو پیسے دے کر منگواتے تھے۔اس کے علاوہ دریائے باڑہ کا پانی بھی صاف کر کے نلکوں کے ذریعے گھروں میں پہنچایا جاتا تھا۔ڈاکٹر ظہور احمد اعوان لکھتے ہیں:

"پشاور مرحوم کا کلچر ماضی ،مہاجروں اور نقل مکانی کی دھند میں گم ہوتا جارہا ہے آج اس کے ایک پہلو یعنی ٹھنڈے کنوئیں یا کھوؤں کے متعلق بات ہو گی۔ آج سے نصف صدی یا آج سے کچھ کم عرصہ پہلے تک جب سائنسی ایجادات نے ثقافتی نشانیوں کو بے دخل نہیں کیا تھا اور گھر گھر کمیٹی کے نلکے فریج اور قدم قدم پر برف کی دکانیں نہیں کھلی تھیں تو اس وقت شہر میں ماشکیوں اور ٹھنڈے کوؤں کا راج تھا۔۔۔دریائے باڑہ کے پانی کو صاف کر کے شہر بھر کے نلکوں میں پہنچایا جاتا تھا اس پانی کی تاثیر یہ بتائی جاتی تھی کہ پتھر کھاؤ تو ہضم کر دیتا ہے۔گھروں میں بعض کنوئیں بہت میٹھے پانی کے بھی ہوتے تھے جن کا پانی سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا ہوتا تھا۔گھریلو کنوؤں کے علاوہ اس زمانے میں مخیر لوگوں نے جگہ جگہ بڑے بڑے خیراتی یا عوامی کنوئیں بھی بنوا دیئے تھے جو انہی لوگوں کے نام سے منسوب اور مشہور تھے۔۔۔سال دو سال بعد ان کنوؤں کی صفائی مقصود ہوتی تھی تو اس کام کے لئے کنوؤں کے خصوصی ماہرین یعنی ٹومے بلوائے جاتے تھے۔یہ ٹومے بالعموم تحصیل گور گھٹڑی کے آس پاس مقیم ہوتے۔افسوس کہ اب نہ کنوئیں رہے،نہ ٹومے اور نہ وہ بوکے۔اب تو ان کی تصویریں بھی باقی نہیں رہیں۔"(13)

ڈاکٹر ظہور احمد کو قدیم پشاور کی یادیں ستاتی ہیں۔انھیں یہ غم بھی ستاتا ہے کہ قدیم پشاور کا روایتی کلچر بھلا دیا گیا ہے۔جدید نسل ان اقدار اور روایات کو پیروں تلے روند کر آگے بڑھ رہی ہے۔انہیں یہ بوسیدہ عمارات،حویلیاں،کنویں،تالاب،نہریں اور گھنے سایہ دار درخت اور دوسرے آثار قدیمہ ایک آنکھ نہیں بھاتے۔جدید سائنس و ٹیکنالوجی کی آمد کے ساتھ یہ قدیم چیزیں وقت کے تیز دھارے میں کہیں گم گئی ہیں۔ڈاکٹر ظہور اعوان بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ بار بار اپنے کالموں میں قدیم اقدار و روایات کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں:

"غالب نے زمانے کو بجان اسد سخت کم آزار بتایا تھا اس لئے کہ وہ اس سے زیادہ توقع رکھتا تھا ہمارے شہر پشاور کے لئے زمانہ سخت ایذا پسند واقع ہوا ہے اور اس کی گلیوں،بازاروں، آثار و عمارات کو مسلسل مٹاتا چلا جارہا ہے۔ایک ہی نسل کے سامنے پشاور شہر کا بنا بنایا رنگ و روپ اجڑا اور برباد ہوا۔یہ نسل ہماری نسل ہے جس کے شعور نے پچاس ساٹھ کی دہائیوں میں آنکھ کھولی۔اس وقت یہ شہر اپنی نشانیوں کے ساتھ موجود تھا،اس وقت موسم بہار میں صبح سویرے سچے گلاب بیچنے والے کی آواز سنائی دیتی تھی۔یہ گلاب لوگ لے کر اپنے مٹی کے گھڑوں میں ڈال دیتے تھے اس طرح گھڑوں کا پانی کئی دن تک معطر رہتا تھا۔۔۔پچاس ساٹھ کی دہائیوں میں موسم گرما میں پشاور کے لوگ پکنک منانے سخی کے چشمے،جان کے باغیچے یا جیلانی کے چھپر پر جاتا کرتے تھے۔ہفتوں پہلے چندہ جمع ہوتا۔طرح طرح کے کھانے پھل فروٹ اکٹھے کئے جاتے۔ صبح سویرے پشاور کے خوش فکرے جواں بوڑھے بچے تانگوں میں بیٹھ کر ان مقامات پر پہنچتے۔جیلانی کی چھپر کے پاس جو نہر بہتی تھی اب چند بدوضع مکانوں کی قطار کا نام ہے۔نہر یہاں اب بھی بہتی ہے مگر یہ گندے نالے کا روپ اختیار کر چکی ہے۔۔۔وہ سرسبز باغ،رومان پرور درختوں کے جھنڈ،وہ مستانہ چال نہر سب چیزیں گم تھیں۔"(14)

پشاور کا دل قصہ خوانی ایک تاریخی بازار ہے۔زمانہ قدیم سے سیاحوں کا مرکز نگاہ رہا ہے۔جس طرح لاہور کے لیے کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا،اس نے کچھ نہیں دیکھا،بالکل اسی طرح جن لوگوں نے پشاور دیکھا اور قصہ خوانی بازار نہیں دیکھا،انھوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔قصہ خوانی شہر پشاور کا تاریخی و ثقافتی مرکز ہے۔قسم قسم کے پکوان،فالودے،کھیر،کتابوں اور پنساریوں کی دکانیں،ملبوسات کے سٹال،۱۹۳۰ء کا یادگار شہیداں،کابلی دروازہ،محلہ شاہ ولی قتال،جہانگیر پورہ بازار،ساتھ ہی چترالی بازار اور پڑوس میں خیبر بازار،دنیا کی وہ کون سی نعمت ہے جو قصہ خوانی میں دستیاب نہیں۔ڈاکٹر ظہور اعوان قصہ خوانی بازار اور یہاں کے شوروغل کے قصے بھی مزے لے لے کر سناتے ہیں،لیکن ساتھ ہی افسوس اور دکھ کا اظہار کر کے آہیں بھی بھرتے ہیں کیوں کہ اب اس بازار میں وہ چھیڑ چھاڑ،وہ مستیاں نہیں رہیں،جن کی وجہ سے اس شہر گلاباں کی رونق ہوتی تھی۔وہ شہر کی بے ہنگم آبادی،لاقانونیت اور احساس زیاں سے عاری لوگوں کے بارے میں جذباتی ہو کر ایک کالم میں لکھتے ہیں:

"قصہ خوانی بازار کے فٹ پاتھوں پر جڑی بوٹیاں بیچنے والے بابوں اور فنکاروں کے مجمعے بھی لگتے۔ پشاور شہر کے بازار ادارے اور انسٹی ٹیوشن تھے۔ اب بے ہنگم انسانی آبادیوں اور ہجوم کے جھاڑ جھنکار ہیں۔ قصہ خوانی بازار میں پارکنگ کیمپ قائم ہو چکا ہے۔ فٹ پاتھ پر دکانیں سج گئی ہیں جس کا جہاں جی چاہتا ہے موٹر کھڑی کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے دکان لگا لیتا ہے۔ شہیدوں کی یادگاریں تکہ فروشوں کی پیڑھیوں کے حوالے ہو گئی ہیں۔"(15)

ڈاکٹر ظہور اعوان نے اپنی تمام تحریروں میں عموماً اور کالموں میں خصوصاً پشاور کی تہذیب و ثقافت کو زندہ رکھا ہے۔ پشاور پر لکھے گئے کالموں میں وہ نہ صرف قدیم پشاوری تہذیب و تمدن اور رسوم و روایات کا ذکر کرتے ہیں، بل کہ حال کی بدحالی اور روایات و اقدار کی زبوں حالی کا رونا بھی روتے ہیں

مذکورہ کالم میں ڈاکٹر ظہور اعوان نے اس بات پر احتجاج کرتے ہوئے کہا ہے کہ شہر پشاور اور اس کی تہذیب و ثقافت کو برباد کرنے اور پیروں تلے کچلنے میں اس شہر کے باسیوں کی غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں۔ اگر اس شہر کے باسی اپنی تہذیب و ثقافت کی نشانیوں کا خیال رکھتے اور ان کی حفاظت کرتے تو آج یہ شہر صحیح معنوں میں گلابوں اور پھولوں کا شہر کہلاتا۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان پشاور میں ہونے والی ادبی و ثقافتی تقاریب، سیمینارز اور مشاعروں کی روداد یں بھی اپنے کالموں میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ پشاور کی ادبی اور ثقافتی فضا ان کے کالموں کا خاص موضوع ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان علمی و ادبی محفلوں کی جان اور رونق سمجھے جاتے تھے۔ وہ پشاور میں ہر ادبی و ثقافتی محفل یا سیمینار میں موجود ہوتے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کو کلاسیکی موسیقی سننے کا بھی بڑا شوق تھا اور اکثر اس قسم کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کو لتا منگیشکر۔ کے ایل سہگل، رفیع، جگجیت سنگھ، نور جہاں، جگ موہن کملا جھریا، استاد بڑے غلام علی خان اور ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم جیسے سدا بہار گلوکار بہت پسند تھے۔ ان کے گانے اور غزلیں شوق سے سنتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک کالم میں پشاور کی ایک ایسی ہی ثقافتی محفل کا نقشہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہم شہر سے باہر ایک مکان میں جا پہنچے جہاں عجیب منظر ہمارا منتظر تھا۔ مرزا غالب کی حویلی کے مردانہ حصے جیسا ایک مکان تھا۔ ایک بڑا سا صحن، برآمدہ، چوبارہ، ایک براسا کمرہ، سر جھکائے خاموشی سے سر دھنتے چند پیر و جوان ماضی کے میٹھے نغموں کی دھن میں گم بیٹھے تھے۔ مہ و سال کی لکیروں میں سے قدیم کلاسیکی موسیقی پھوٹ رہی تھی۔ ہر سر سرور سے شاداں تھا۔ ہر آنکھ پیچھے کو لوٹ کر ماضی کی مسرتوں میں گم ہو رہی تھی۔ ایک بزرگ آثار جوان نما دبلا سمارٹ سا شخص پرانے ریکارڈوں کے انبار میں بیٹھا اپنے باجے میں ٹکیہ پر ٹکیہ جما رہا تھا۔ کے ایل سہگل، جگ موہن کملا جھریا، استاد بڑے غلام علی خان، جوتکیہ رائے، زہرہ بائی انبالے والی، اختری فیض آبادی کے سی ڈے اور ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم کی مدھر آوازیں جادو برسا رہی تھیں کملا جھریا جب نعت رسول ﷺ کے یہ بول سنا رہی تھیں تو ماضی کی یادوں میں گم چہروں پر جڑی آنکھیں آنسوؤں کے جھرنے برسانے لگیں۔

تمرے دیا کی آس محمد ﷺ
یاپی (پاپی) ہوں کچھ نہیں پاس محمد ﷺ
میں ہوں جگت کے پالن ہارے
میں ہوں تمہاری داس محمد ﷺ
ہند سے اپنے پاس بلا لو
بیٹھا ہے ساقی اداس محمد ﷺ

اور جب میرا بائی کا یہ بھجن فضا میں گونجا کہ "گھونگھٹ کا پٹ کھول سکھی تجھے پیا ملیں گے" تو صاحب ذوق سامعین کی چیخیں نکل گئیں۔"(16)

لاہور پاکستان کا ایک تاریخی اور قدیم شہر ہے، جو پنجاب کا دل اور دارالحکومت کہلاتا ہے۔ لاہور تہذیبی و ثقافتی رعنائی اور رنگینی کے باعث

بھی پاکستان کے پسندیدہ شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مینار پاکستان، بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، داتا دربار، شالیمار باغ، واہگہ باڈر، اردو بازار، انار کلی بازار، گورنمنٹ کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میوزیم، چڑیا گھر، مقبرہ جہانگیر و نور جہاں جیسی تاریخی و ثقافتی عمارتوں، جگہوں اور فن و فن کاروں کے حوالے سے یہ ایک ہر دلعزیز شہر ہے۔ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں ڈاکٹر ظہور اعوان اپنے ایک کالم "لاہور لاہور ہے" میں لکھتے ہیں:

"اگر لاہور لاہور ہے تو کراچی بھی کراچی ہی ہے پشاور بھی پشاور ہے مگر کچھ باتیں ہیں جو لاہور کو دوسرے شہروں سے الگ کرتی ہیں۔ لسی پیڑوں کے قد آدم گلاسوں اور دیو قامت پہلوانوں، ماجھوں پتنگوں اور تانگہ بانوں سے بڑھ کر بھی کچھ چیزیں ہیں ۔لاہور کو داتا کی نگری بھی کہا جاتا ہے۔ لاہور میں اترنے والے سبھی قدم دربار کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ اس زیارت گاہ عالم کا نرالا ہی سماں ہے پھولوں کے کجرے چھوارے جلیبیاں نقل رنگین چادریں گوٹے کناریاں تیل عطر پھلیل اچار، پوریاں، چوڑیاں، کھنکتے قہقہے کھانستی عقیدتیں روتی مسرتیں اافسردہ ارمان جوان امنگیں لرزتے خوفزدہ ہاتھ۔ پہلی محبت کے تیر کھائے ہوئے کمسن دل۔ بھیگتی ہوئی مسوں اور پھیلتی ہوئی غزالی آنکھوں کے نیچے کانپتے نتھنے اور ہونٹوں کے کونے کیا کچھ نظر نہیں آتا۔ ٹھنٹھناتی دیگیں، قوالیوں کا شور، کبوتروں کی پھڑ پھراہٹ، پرندوں کی سہمی سہمی نگاہیں، ہر دل سینے کے پنجرے سے ابل کر باہر آنے کو تیار ایک شور ایک ہنگامہ، عقیدت بھری کیسٹیں، اغراض سے معمور دل حرص و آز سے بھرے دماغ، سادہ لوگ، اندر کے ہزاروں چوروں کو چھپائے دل زدگان ماتھے ٹیکتے اور سر رگڑتے نظر آتے ہیں۔"(17)

متذکرہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر ظہور اعوان نے لاہور کے داتا دربار کے ارد گرد برپا ہونے والے بازار، پنجاب کی دھرتی سے جڑی ثقافتی اشیا اور انسانوں کے ظاہر و باطن کی کتنی سچی اور کھری عکاسی کی ہے۔ اس عبارت میں ظہور اعوان کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی جزئیات نگاری عروج پر نظر آتی ہے، جس سے داتا دربار کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

بسنت اور پتنگ بازی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب بھی برصغیر میں بہار کا موسم آتا ہے۔ فطرت انگڑائیاں لیتی ہے اور چاروں سمت سرسوں پھولتی ہے، ہریالی اگتی ہے تو پرندے خوشی اور مستی سے گانے گنگنانے لگتے ہیں، جب کہ انسان گھومنے پھرنے اور سیر سپاٹے کے لیے سبزہ زاروں اور گلزاروں کا رخ کرتے ہیں، ٹھنڈی ہواؤں، پھولوں کی خوشبوؤں اور رنگوں سے کھیلتے ہیں، زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں اور طبیعت کا رنگ اتارتے ہیں۔ برصغیر میں برسوں سے بسنت کا تہوار منایا جاتا رہا ہے۔ یہ تہوار برصغیر کے علاوہ ایران اور وسطی ایشائی ممالک میں بھی مختلف ناموں سے پکارا اور منایا جاتا ہے۔ پاکستان میں اہل پنجاب کے لاہوریے اسے بڑے چاؤ اور چاہ سے مناتے ہیں۔ اس موسم میں لاہوریے شوخ رنگ کے کپڑے زیب تن کرتے ہیں اور پتنگیں لے کر کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ اس دوران نیلے آسمان کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔ سارا آسمان رنگ رنگ کی پتنگوں سے سج جاتا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے ایک کالم "پتنگ اور پتنگ کی ڈور" میں بسنت کی خوشیوں سے پیدا ہونے والی فضا اور اس کی ثقافتی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"برصغیر کے مختلف علاقوں میں ان خوشی بھری ساعتوں میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کی رسمیں عادتیں طور طریقے صدیوں کے سفر میں خود بخود پیدا ہوتے گئے ہیں۔ انہی میں سے ایک پتنگ اڑانا بھی ہے زندگی میں کبھی کبھار چند دنوں کے لئے بے غرض ہنسی ہنسنے کو ہر کسی کا جی چاہتا ہے۔ بلاوجہ خوش ہونے اور قہقہے لگانے کی آرزو جاگتی ہے بچے بوڑھے جوان بچیاں خواتین سگھڑ گھر ہستنیں (ہستنیں) اور بڑے بزرگ پتنگ ڈور لے کر کوٹھوں پر چڑھ جاتے ہیں چمن زاروں باغوں میں نکل آتے ہیں کھیت پیلے پیلے پیرہن پہنے ہوتے ہیں سبزہ و گل ہنس ہنس کے اپنی زندگی کی خبر دیتے ہیں بچے بوڑھے جوان زرد دوپٹے صافے گلے سے لپیٹ لیتے ہیں۔ ایک کھیل ایک تماشہ ایک میلہ سا مچ رچ سج جاتا ہے۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑتا کوئی کسی پر نہیں بگڑتا۔ کاغذ کی رنگ برنگی پتنگیں طرح طرح کے دھاگے مانجھے۔ قسما قسم چرخیاں ہاتھوں میں لئے مرد و زن قہقہ زن ہوتے اور بوکاٹا وہ کاٹا وہ کاٹا کی آوازیں لگا کر اپنے دلوں کو مسرور کرتے ہیں۔"(18)

میلے ٹھیلے اور تہوار بھی کسی قوم کی ثقافتی نشانیوں اور پہچان میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میلوں ٹھیلوں اور تہواروں سے کسی قوم کی تاریخ بھی

مرتب کی جاسکتی ہے اور ثقافتی اہمیت کا بھی پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے ایک کالم میں بری امام کے میلے کا ذکر کیا ہے۔ یہ میلہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے بچپن کی ایک یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔ یہ ان کا ناسٹلجیا بن چکا ہے، جسے وہ بھلانے کی جتنی بھی کوششیں کرتے ہیں، اتنا ہی یہ زمانہ ان کو بار بار یاد آتا ہے۔ اس کالم میں اس میلے کی تاریخ ،لوگوں کے عقائد و اوہام، رقص و سرود کی محفلوں، مشہور فن کاروں، پٹھانوں، پہلوانوں، بدمعاشوں، کبوتر بازوں، نوسر بازوں، جادوگروں، جیب کتروں، بہروپیوں، حلوائی و شیر فروشوں، کپڑے کے تاجروں، کھیل تماشوں، ہنڈولوں، سرکس اور نور پور شاہاں (جس گاؤں کے قریب یہ میلا لگتا تھا) کے ابلتے چشموں، گاتی گنگناتی ندیوں اور گھنے جنگلات کا ذکر مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور بچپن کی یادوں کو تازہ کیا ہے لیکن اس بات پر افسوس بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ زمانہ بیت گیا اور بری امام کا میلہ ایوب خان کی مارشل لا کی نذر ہو گیا:

"یہ پچاس کی دہائی کے ابتدائی سالوں کا قصہ ہے۔۔۔ اس زمانے میں میلوں ٹھیلوں کا رواج عام تھا سال بھر جگہ جگہ میلے لگتے تھے رقص و سرود کی محفلیں کھلے عام سجتی تھیں، میلے ٹھیلوں میں رنگ رنگ کی کوٹھے والیاں اور بائیاں اپنا روپ دکھاتی تھیں۔۔۔ یہ وہی دور تھا جب راولپنڈی سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ایک سرسبز و شاداب گاؤں نور پور شاہاں میں بری امام کا میلہ لگتا تھا۔۔۔ اس علاقے میں اس وقت اسلام تو آچکا تھا اسلام آباد نہیں آیا تھا یہاں ایک بزرگ بری امام سرکار کا مزار تھا جو مرجع خلائق تھا۔۔۔ انہی میلوں میں میں نے مشہور فنکارہ نسیم بیگم کو بھی سنا تھا ملنا جلنار قیباں دابند کر دے تیرا مخملی پیٹ میں پھاڑ دیساں کے نغمے سنے تھے۔ دن کے لوگ اوپر پہاڑ میں شیر کی (کا) غار دیکھنے جاتے تھے ایک روایت کے مطابق شیر اوپر سے آکر مزار پر جھاڑو دیا کرتا تھا جہاں ندی میں ایک پتھر کا ٹکڑا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ایک بھینس ہے جو پتھر ہو گئی ہے طرح طرح کے قصے کہانیاں افسانے سنے سنائے جاتے تھے اب یہ ساری باتیں ہی افسانے معلوم ہوتے ہیں اب میں جا کر علاقے کو دیکھتا ہوں تو صرف روپڑتا ہوں۔"(19)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے اپنے کالموں میں مقامی و قومی تاریخ و ثقافت کے علاوہ غیر ملکی اقوام کی تاریخ و تہذیب اور ثقافت کی بھی عمدہ اور حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے امریکا، بھارت، ترکی اور یورپ کے کئ ممالک کی سیر کی اور ان ممالک میں رہنے والے لوگوں کی عادات و اطوار اور رسومات کے علاوہ ان اقوام کی تاریخ پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے جہاں ان قوموں کی اچھی صفات و عادات بیان کی ہیں وہاں ان کی بری عادات و حصلتیں بھی بے نقاب کی ہیں۔ اپنے ایک کالم میں وہ ہالینڈ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے، ڈچ قوم کی ثقافتی خصوصیات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اس قوم نے بڑی ہمت سے اپنے ملک کو سمندری یلغار سے بچا لیا ہے ڈچ قوم اور ملک جفاکش اور جنگجو و مالدار قوم بھی رہی ہے پرانے زمانے میں یہاں کلیٹس Celts لوگوں کا قبضہ بھی رہا ہے۔ پھر رومن اور فرانسیسی آئے۔ رومنوں کی حکومت چار سو برس تک قائم رہی۔ تیسری صدی عیسوی میں فرانک لوگوں کا غلبہ قائم ہوا۔ فرانسیسی بادشاہ شارلیمین ۸۱۴ء میں مرا تو اس کی اولاد سلطنت پر تسلط برقرار نہ رکھ سکی یوں نیدرلینڈ میں طوائف الملوکی نے سر اٹھایا اور قسم قسم کی جاگیریں قائم ہو گئیں۔ اس کا بڑا حصہ مقدس رومن ایمپائر میں بھی شامل رہا۔ سمندری اٹھان نے اس قوم کو زمینوں کے محافظوں کا کردار ادا کرنے پر مجبور کیا اور اس سرزمین کا بہت سا حصہ سمندر سے چھین کر بنایا اور اپنایا گیا۔۔۔ فٹبال یہاں کا پسندیدہ کھیل ہے جس کے بڑے بڑے عالمی معیار کے سٹیڈیم یہاں قائم ہیں۔ ہاکی بھی بڑا کھیل مقبول ہے۔ جب نہریں اور دریا برفیلے ہو جاتے ہیں پھر سائیکلنگ یہاں کا سب سے بڑا مشغلہ ہے۔"(20)

فرانس دنیا کا خوب صورت ترین ملک ہے۔ اگر یورپ میں کوئی ملک نئ ادبی تحریکات، ثقافت، انٹیلکچوئلزم کے حوالے سے مشہور ہے تو وہ فرانس ہے۔ فرانس ادیبوں، شاعروں، فن کاروں، دانشوروں اور انقلابیوں کا ملک ہے۔ ڈرامے کی صنف میں راسین اور مولیئر کے نام سامنے آتے ہیں۔ موپساں جدید افسانے کی دنیا کا بڑا نام ہے تو فلابیئر مشہور زمانہ ناول "مادام باوری" کا خالق ہے۔ ژاں پال سارتر انقلابی سوچ اور ذہنیت کا مالک اور حکمت و دانش کی پوٹ جب کہ سائنس و حکمت کی دنیا میں میری کیوری اور لوئی پاسچر کی ایجادات قابل توجہ ہیں۔ اس کے علاوہ والٹیئر، روسو، بالزاک

اور ایمیلیا زولا علمی و ادبی دنیا کے بڑے نام ہیں، جن کے نام اور کام سے ساری دنیا آشنا ہے۔ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کسی زمانے میں فرانس بھی گئے اور فرانس کے بے پناہ حسن اور دل کشی سے خوب محظوظ ہوئے۔ڈاکٹر ظہور اعوان فرانس کی تاریخ و ثقافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فرانس کی تاریخ جنگوں اور فتح و شکست کی حیران کن داستانوں سے عبارت ہے۔ ۱۸۵۱ء میں نپولین کا ایک بھتیجا نپولین تھرڈ کے نام سے بادشاہ بن بیٹھا۔ ۱۸۷۰ء میں جرمنی نے فرانس کے خلاف زبردست جنگ کی جس کے نتیجے میں نپولین ثالث نے اپنی ایک لاکھ افواج کے ساتھ ہتھیار ڈال دیئے اور اس نے جرمنی کو ایک ارب ڈالر کا ہرجانہ دینا منظور کیا۔ اس وقت جنگ عظیم اول چھڑ گئی اور جرمنی نے فرانس کو گھیرے میں لے لیا پہلی جنگ میں فرانس کے ۱۳ لاکھ مارے گئے اور چار لاکھ زخمی ہوئے مگر فرانس نے اپنی تعمیر نو جلد کرلی۔ ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں ہٹلر برسر اقتدار آیا تو ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں پھر ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم دوم چھڑ گئی۔6 جون ۱۹۴۴ء کو یورپ و امریکہ کی افواج فرانس کے نارمنڈی ساحل پر لاکھوں کی تعداد میں اتریں اور خونریز جنگ ہوئی جس میں فریقین کے لاکھوں سپاہی مارے گئے مگر جرمنی کو شکست ہوئی اور فرانس پھر سے آزاد ہو گیا اور پھر بڑھتے بڑھتے ترقی کرتے ہوئے پھر سے ایک بڑی اقتصادی اور ایٹمی قوت بن گیا ہے۔"(۲۱)

ڈاکٹر ظہور اعوان نے فرانس کے شہر پیرس کی ثقافت اور خوبصورتی کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس شہر کو دیکھنے کے لیے لوگ سات براعظموں سے آتے ہیں اور اس کی الف لیلوی رومان پرور فضاؤں اور پر اسرار رنگینیوں کے چرچے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ روئے زمین پر اگر کوئی خوب صورت شہر ہے تو وہ پیرس ہے۔ پیرس کی ثقافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ شہر فرانسیسی تہذیب و ثقافت اور فن و تاریخ کا آئینہ خانہ ضرور ہے اگر کچھ شہر اپنی خوشبو اپنی شناخت رکھتے ہیں، اپنے ذائقوں سے پہچانے جاتے ہیں اپنی نفاست اور اپنی شان اپنی روشنیوں اور گلیمر کی منفرد مہک رکھتے ہیں تو پیرس ان میں سرفہرست ہے۔ ۔۔ایفل ٹاور ایک عجوبہء جہاں ہے۔ نیچے کھڑے ہو کر اسے دیکھیں تو ٹوپی گر جائے۔ اس پر لوگ پیدل بھی چڑھتے ہیں اور لفٹوں اور خودکار سیڑھیوں کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا اور حیران کن میوزیم لوور ہے اس کے اندر اتنے تاریخی نوادرات ہیں جتنے دنیا بھر کے عجائب گھروں کو ملا کر بھی نہیں ہوں گے۔ ہم نے ایک بہت بڑے چوک میں وہ ٹاور بھی دیکھا جو فرانسیسی بادشاہ نپولین مصر سے اٹھالایا تھا۔ وہاں سے نکلے تو پھر آگے دو ڈھائی کلو میٹر کی دنیا کی سب سے پر رونق اور مشہور سڑک اور بازار شانزے لیزے ہے۔ مشہور زمانہ نوٹرڈیم کا قلعہ، باستیل کا زندان سبھی کچھ کی نشانیاں موجود تھیں۔ پیرس کے چپے چپے پر تاریخ کی مہریں ثبت تھیں۔"(22)

کالم "آسٹریلوی قوم کی اخلاقی اقدار" میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے آسٹریلوی قوم کی کچھ ایسی اخلاقی و ثقافتی حوالے بیان کیے ہیں، جن کی بدولت یہ دنیا کی دوسری قوموں سے منفرد اور جدا حیثیت و شناخت کی حامل بن گئی ہے۔ اس کالم میں آسٹریلوی قوم کی تاریخ و ثقافت اور اخلاقیات کے علاوہ آسٹریلوی کرکٹ ٹیم کے مشہور و معروف کھلاڑی مارک ٹیلر کے بارے میں بھی بڑی اہم باتیں درج ہیں۔ اس کالم سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"آسٹریلوی ٹیم اصلی باشندوں پر مشتمل ہے یا آبادکار یورپی اقوام کی اولاد ہے لیکن یہ طے ہے کہ اس قوم نے تاریخ کے لمبے سفر میں بہت کچھ سیکھا ہے کچھ عرصہ پہلے تک آسٹریلیا کی تین شناختیں بتائی جاتی تھیں جو سب انگلش کے حرف ڈبلیو(W) سے شروع ہوتی تھیں یعنی گندم WHEAT، اون WOOL، اور خوبصورت عورتیں WOMEN آسٹریلیا کی آبادی کم اور زمین زیادہ زرخیز ہے اس لئے وہاں بہت زیادہ گندم ہوتی ہے۔ آسٹریلیا میں بھیڑیں بھی بہت زیادہ پائی جاتی ہیں بے تحاشا دودھ، گوشت اور اون حاصل کی جاتی ہے پھر عورتیں(عورت ویسے بھی اللہ تعالیٰ کی حسین مخلوق اوپر سے یورپ کی کوہ قاف نشین CAUCASIAN)۔۔۔ ہمارے ملک کا دورہ کرنے والی ٹیم اس کوہ کاف کونسل (نسل) سے تعلق رکھتی ہے اس میں ایک کھلاڑی مارک ٹیلر بھی پائے جاتے ہیں جنہوں نے پشاور ٹیسٹ کے دوران 334 رنز بنا کر اپنے ہی ہم وطن عظیم و بزرگ کرکٹر ڈان بریڈمین کا ریکارڈ برابر کر دیا۔(23)

اس مطالعے کو مد نظر رکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے تاریخ و ثقافت کے تمام پہلوؤں کو اپنے کالموں میں سمیٹا ہے۔ انھوں نے صرف پشاور کی تاریخ و ثقافت بیان نہیں کی، بل کہ لاہور، اسلام آباد، کراچی اور ایبٹ آباد کے علاوہ امریکا، بھارت، برطانیہ، فرانس اور ترکی کے کئی شہروں کی تاریخ و ثقافت کو بھی اپنے کالموں میں جگہ دی ہے، اس لیے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالم اس بنا پر ایک تاریخی و ثقافتی دستاویز کا درجہ اختیار کر چکے ہیں، جن سے آنے والے محققین سنگ راہ کا کام لے سکیں گے۔

حوالہ جات

1۔ خالد سہیل ملک، پروفیسر، دل پشوری (خاکہ) غیر مطبوعہ، ص:2

2۔ محمد اقبال پراچہ، پروفیسر، ظہور اعوان کی کالم نگاری (مضمون) بیکار مباش از ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، ادارہء علم و فن پاکستان پشاور، جنوری 1997، ص:54

۳۔ روبینہ شاہین، پروفیسر، ڈاکٹر ، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کالم نگاری، مضمون، مشمولہ، حدیث دیگراں ، مرتبہ: فرحت ظہور، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص:621

۴۔ فیروزالدین، مولوی، فیروز اللغات، فیروز سنز لاہور، 967ء، ص:301

۵۔ پشاور کی خوشبو (کالم)، پچیسواں گھنٹہ (دل پشوری کالموں کا مجموعہ) جلد دوم، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن، ص:757

6۔ خالد سہیل ملک، پروفیسر، دل پشوری (خاکہ)، غیر مطبوعہ، ص:3

۷۔ پشاور شہر وسط ایشیاء کا دروازہ (کالم)، مشمولہ کالم کلامیاں، ادارہ علم و فن (پاکستان) پشاور، ستمبر 1995ء، ص:245۔246

8۔ محبوب کی گلی گھنٹہ گھر اور گھنٹہ بھر (کالم) مشمولہ بیکار مباش، ادارہء علم و فن پاکستان پشاور، جنوری 1997ء، ص:464 تا 467

9۔ چتراں والا کٹورہ اور ماں کی یاد (کالم) مشمولہ اردو ادبی صحافت، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، دسمبر 2008ء، ص:47

10۔ قہوے کی ریسائیکلنگ، قصہ خوانی کے تھڑے (کالم) مشمولہ کالم کلامیاں، ادارہ علم و فن (پاکستان) پشاور، ستمبر 1995ء، ص:120 تا 122

11۔ یاد ماضی عذاب ہے یارب (کالم) مشمولہ فاسٹ فوڈ (فار تھاٹ)، ادارہء علم و فن (پاکستان) پشاور، اپریل 2001ء، ص:518

12۔ شاہی باغ اور بچپن کی تلاش (کالم) مشمولہ فاسٹ فوڈ (فار تھاٹ)، ادارہء علم و فن (پاکستان) پشاور، اپریل 2001ء، ص:512

13۔ فطری نعمت کے خزانے ٹھنڈے کھوہ (کالم) مشمولہ فاسٹ فوڈ (فار تھاٹ)، ادارہء علم و فن (پاکستان) پشاور، اپریل 2001ء، ص:529 تا 531

14۔ گمشدہ پشاور کی دستک (کالم)، مشمولہ بیکار مباش، ادارہء علم و فن پاکستان پشاور، جنوری 1997ء، ص:468۔469

15۔ ڈھونڈ کے لاؤ میرا شہر (کالم)، ایضاً، ص:472 تا 474

16۔ موسیقی کی کان میں ایک چھلانگ (کالم) مشمولہ فاسٹ فوڈ (فار تھاٹ)، ادارہء علم و فن (پاکستان) پشاور، اپریل 2001ء ص:495۔496

17۔ لاہور لاہور ہے (کالم)، مشمولہ دل پشوری (طنز و مزاح)، ادارہء علم و فن (پاکستان) پشاور، جنوری 1996ء، ص:40۔42

18۔ پتنگ اور پتنگ کی ڈور (کالم) مشمولہ بیکار مباش، ادارہء علم و فن پاکستان پشاور، جنوری 1997ء، ص:373۔374

19۔ میلہ بری امام کا (کالم)، بعنوان پشاور نامہ، مطبوعہ روزنامہ "مشرق" پشاور، بروز پیر 5 مئی 1997ء، ص:06

20۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، ہالینڈ تاریخ جغرافیہ کے آئینے میں (کالم) بعنوان دل پشوری، روزنامہ "آج" پشاور، 11 اگست 2007، ص:3

21۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، فرانس تاریخ کے آئینے میں (کالم)، بعنوان دل پشوری، روزنامہ "آج" پشاور، 23 اگست 2007 ، بروز جمعرات، ص:3

22۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، پیرس بائی ڈے پیرس بائی نائٹ (کالم)، بعنوان دل پشوری، روزنامہ "آج" پشاور بروز پیر، 20 اگست 2007ء، ص:3

23۔ آسٹریلوی قوم کی اخلاقی قدار، پچیسواں گھنٹہ (جلد اول)، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن، ص:347۔348